

وادی کے پہاڑ سے پہلا رنگ



دنیا بھر سے، ادھر ادھر سے توشہ خاص، خواندہ فہم رنگ
مختصر مختصر، دل سنا، خوش نما، فرحت اثر حیاتِ بدور
سات زبانوں کے ساتھ کہانیاں
سکندھ اور اردو کے عہد ساز شاعر اور ادیب شیخ ایاز کا قلم پارہ
ایک شوخ و شنگ لڑکے کا داستان، اس کے پاس بہت
پھول تھے، بہت پھول اور بہت ریشم اور بہت...
ترجمہ پو ستار

نکالا تھا

نکالا تھا! ”دیکھو میں نے اس پر جاؤ کیا ہے۔“ اس نے کہا۔
میں نے شرارت بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے
کہا۔ ”تم تو انسان پر بھی جاؤ کر سکتی ہو۔“
اس کے چہرے پر شرم کی سُرخی دوڑ گئی اور ہنستو میری گود
میں اچھال دیا۔
میں ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا اور اسے چُپا سے پکڑ کر بولا۔
”کو پھر ایسے کر دو گی؟“
”نہ بابا میری توبہ، میری امی کی بھی توبہ!“ اس نے چُپا
چھڑاتے ہوئے کہا۔
ایک دن دوپہر کو آتے ہوئے مجھے دیر ہو گئی تو وہ کھانا لے
کر آئی۔ میں نے بت کہا کہ خود ہی کھاؤں گا لیکن وہ نہ مانی۔

اس کی سادگی میں چالاکی تھی، چالاکی میں سادگی۔ کبھی
چنے کی طرح دوزئی ناچتی آیا کرتی تھی اور میرے پیچھے سے آکر
آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیتی۔ کبھی میرے بال بکھیر کر کہتی۔ ”دیکھو
تو کیسے لگ رہے ہو؟“ اور پھر شیشہ اٹھا کر ہاتھ میں دے دیتی۔
کبھی میں میٹل چیلتا تو وہ اسے توڑ دیتی اور اسے اٹھانے کی
کوشش کرتا تو ہنسی میں لوٹ پوٹ ہو جاتی۔ کبھی دوپٹے کی پگڑی
باندھ کر آ جاتی اور میرے ہاتھ سے کتاب چھین کر کہتی۔ ”کو اب
کیا کہہ رہے ہو؟“ کبھی پن اٹھا کر میری گردن میں چھو دیتی،
کبھی شربت میں نمک ملا کر لے آتی، کبھی بھڑ پکڑ لاتی اور وہ مجھے
دکھا کر ڈرانے کی کوشش کرتی۔
ایک دن چھوٹا ہتھیلی پر لے آئی۔ نہ جانے کیسے اس کا ڈنک

شیخ ایاز، 23 مارچ 1923ء، شکارپور میں پیدائش، اصل نام شیخ مبارک علی۔ والد، عدالت میں پیش کار، مطالعے اور سیروسیاحت کے دل دادہ، شیخ غلام حسین، ابتدائی تعلیم شکارپور، وہیں سے میٹرک، بمبئی یونیورسٹی سے انٹرمیڈیٹ، فارسی میں انیس ہزار طلبہ میں اول، ڈی جے کالج سندھ سے فارسی میں بی اے، سندھ یونیورسٹی سے 1950ء میں ایل ایل بی کی سند، پہلے کراچی پھر سکھر میں وکالت اور نہایت کامیاب وکیل۔ سیاست میں دل چسپی اور عوامی لیگ کی مرکزی کمیٹی کے رکن، جی ایم سٹیڈ کی قوم پرستانہ تحریک سے وابستگی، ون یونٹ کے قیام کے شدید مخالف اور اس سلسلے میں گرفتاری۔ دس سال کی عمر میں پہلا شعر، شاعری کے مجموعے ”بھونر بھرے آکاس“ مطبوعہ 1962ء، پر پابندی ایک اور مجموعے ”کلسی پاتم کنیرو“ مطبوعہ 1963ء، بھی ضبط اور قید و بند، نثر کا کلیدی مجموعہ ”جی کاک ککوریاکاپڑی، مطبوعہ 1964ء، پر بھی پابندی اور گرفتار۔ تین بار جیل، 1976ء میں سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر، 1978ء میں سبک دوشی، 1987ء میں علالت کے باعث سیاست سے کنارہ کشی۔ برصغیر کے صوفی شاعر شاہ لطیف بھٹائی کی عظیم الشان تخلیق ”شاہ جو رسالو“ کا منظوم اردو ترجمہ، ساٹھ سے زیادہ کتابوں کے مصنف، مزید پندرہ کتابیں مسودوں کی شکل میں، اخباروں اور رسالوں میں بکھری ہوئی تحریریں اس کے علاوہ 28 دسمبر 1997ء دل کے چوتھے دورے میں انتقال، خواہش کے مطابق شاہ لطیف کے پہلو میں تدفین۔

سندھی، اردو اور انگریزی میں شیخ ایاز کے فکر و فن کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ ابھی حال ہی میں مکتبہ دانیال کی طرف سے دو اہم کتابیں فکر ایاز اور ذکر ایاز شائع ہوئی ہیں۔ ان کتابوں کے مرتب آصف فرخی اور شاہ محمد پیرزادہ نے شیخ ایاز پر شائع ہونے والے ملک کے نام ور ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کے مضامین اور تبصرے یک جا کر دیے ہیں۔ انہیں دیکھیے۔ سراج الحق میمن نے لکھا ہے۔ ”شاہ لطیف کے بعد شیخ ایاز سب سے زیادہ نمایاں اور اہم شاعر ہیں بلکہ انہیں ایک ادبی معجزہ سمجھنا چاہیے۔“ بھوگیان چندانی کی بھی کچھ یہی رائے ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ ”اُس سے کتنے ہی اختلاف ہوں لیکن ماننا پڑے گا کہ شاہ لطیف کے بعد وہ سندھ کا عظیم شاعر تھا۔ رسول بخش پلیجو کے مطابق۔“ شیخ ایاز کی شاعری میں عالمی سطح کا ذہن ملتا ہے۔ وہ ایک ایسا شخص ہے جو سارے زمانے کی اعلیٰ ترین فکر و فن سے آگاہ ہے۔“ امر جلیل کہتے ہیں۔ ”اُن کے شعری اسلوب سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ جیسے کبیر، کالی داس، رومی، ملتن، کیٹس، بابا فرید، بلھے شاہ، سچل سرمست اور شاہ لطیف بھٹائی ایسے صوفی مزاج شاعروں سے اُن کا ایک روحانی تعلق ہے۔“ ڈاکٹر جمیل جالبی کا فرمودہ ہے۔ ”شیخ ایاز اپنے عصر کی آواز تھے، اُن کی آواز شاہ لطیف بھٹائی کے بعد سندھی زبان کی سب سے بڑی آواز ہے۔“ عطا صدیقی نے لکھا ہے۔ ”وہ ایسے دیوقامت تھے جس نے زبانوں، روایتوں اور تاریخ کی باگیں تھام رکھی تھیں۔ شیخ ایاز کے ساتھ ہی

زبردستی نوالے بنانا کر منہ میں ٹھونسنے لگی۔
 ”سب عورتیں بے وقوف ہو کر تھیں۔“ میں نے غصے سے کہا۔ ”اس لیے تو تم بھی پاس نہیں ہو رہی ہو۔“
 ”ٹھیک ہے۔“ اُس نے ہڈی نوالے میں مچھا کر منہ میں ڈال دی۔ ہڈی چبا کر میرا منہ خراب ہو گیا تو وہ بھاگ گئی۔ میں نے غصے سے کہا۔ ”بس پھر کبھی یہاں نہیں آؤں گا۔“
 ”ارے دیکھتی ہوں، کتنے دن نہیں آؤ گے، کتنے دن اس شور و غل میں پڑھ سکتے ہو۔“ اُس نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے کہا۔ ”گھر میں ایک لفظ بھی پڑھ سکے تو کہنا۔“
 میں نے سوچا کہ کہہ تو چکا ہے۔
 ہمارا گھر چھوٹا تھا اور بچے بھی زیادہ تھے، اس لیے میں ان کے گھر آ کر پڑھتا تھا۔ اس کے گھر میں صرف دو افراد تھے، خالہ

اور وہ لیکن اس نے میرا ناک میں دم کر دیا تھا۔ ہر روز نئی شرارتیں سوچا کرتی تھی۔
 جب میٹرک میں فیل ہو گئی تو پڑھنے کا خیال ہی ذہن سے نکال دیا اور اب میرے پیچھے پڑ گئی تھی۔ ایک دن میرے ہاتھ میں کمرادیکھ کر ضد کرنے لگی کہ میری تصویر کھینچیں۔ بڑی تگ و دو کے بعد جب میں نے تصویر کھینچی تو اس نے دوپٹے میں منہ مچھاپا لیا۔
 ایک مرتبہ میں ابھی کتاب لے کر ہی آیا تھا۔ کمرے میں دو چار لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ میں جوں ہی کمرے میں داخل ہوا سب ہنسنے لگیں اور وہ اتنا ہنسی کہ پیٹ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئی۔ میں نے جھینپ کر اسے کہا۔ ”خیر تو ہے؟“

”تم پر تو نہیں ہنس رہے تھے۔“ اُس نے ہنسی روک کر کہا۔ ”تم خود بتاؤ تمہاری شکل ایسی ہے کیا؟ تمہاری شکل دیکھ کر سب ہنسنے لگتے۔“

دیوتاؤں کا دور تمام ہوا۔" عطیہ داؤد لکھتی ہیں۔ "بھٹائی کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا اور اب اسی طرح ایاز کی جگہ بھی کوئی نہیں لے سکتا۔ صدیاں ایاز کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔" تاجل بیوس کی رائے میں۔ "شیخ ایاز وہ کچھ دے کر گئے ہیں جو ہر دور میں ہماری رہ نمائی کے لیے کافی ہوگا۔" رؤف نظامانی کہتے ہیں۔ "اُن کی شخصیت، اُن کی شاعری کی طرح کھلی کتاب ہے۔ تقریباً نصف صدی کے تخلیق کردہ ادب پر اُن کی گہری چھاپ ہے۔" فہمیدہ ریاض کہتی ہیں۔ "وہ ایک جادوگر تھے اور ہمیں حیران کر گئے۔ اُن کی شاعری میں ہیرے کی کنی کی سی سخت چمک تھی۔ شیخ ایاز آزادی کے بعد برصغیر ہندوپاک کے سب سے بڑے شاعر تھے۔ اُن کے قلم سے کبھی کوئی ہلکی سطر نہ لکھی گئی۔ وہ زندگی میں بھی ایک چیلنج تھے، مرنے کے بعد بھی ایک چیلنج ہیں۔" زاہدہ حنا نے لکھا ہے۔ "سندھی ادب کے آسمان پر اٹھارویں اور بیسویں صدی کے زمانوں کے درمیان کھنچی ہوئی شعروں کی دھنک کا ایک سرا اگر شاہ لطیف ہیں تو دوسرا شیخ ایاز۔ اور اس دھنک کے سات نہیں، ستر نہیں، سات سو رنگ ہیں۔" محمد علی صدیقی لکھتے ہیں۔ "شیخ ایاز کائنات کو ایک فریب نظر، فریب ادراک، دکھ ہی دکھ یا ناقابل اعتبار نہیں سمجھتے تھے بلکہ وہ آئن اسٹائن کی طرح کائنات کی پہنائیوں میں گم ہوتے چلے گئے۔ ان کا خیال تھا کہ تمام چیزیں خواہ جزوی ہوں یا کُلّی، معنوی ہوں یا خارجی یا کہ داخلی ہوں، وہ سب کی سب وجود حق سے موجود ہیں بلکہ حق ہی موجود ہے۔" ولی رام ولیہ کے مطابق "اُن کی تحریریں ہزاروں صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں جو اُن کو کرم یوگی جیون کے مقابلے میں ایک مہان یوگی کے اونچے مقام پر پہنچاتی ہیں اور برصغیر کے عظیم شاعر ٹیگور کے ساتھ کھڑا کر دیتی ہیں۔" محمد آصف خاں نے کہا ہے۔ "ایاز کا سیاست سے دور کا واسطہ بھی نہیں رہا لیکن وہ سیاست میں الجھ گئے، حقیقت میں وہ شاعر ہیں، وہ انصاف کے متمنی ہیں۔ وہ طبعاً صلح کل کے حامی ہیں اور امن عالم کے مبلغ "حمایت علی شاعر کا کہنا ہے۔" ایاز کی شاعری کا ٹھنڈے دل سے مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ تاریخ زندہ لفظوں میں بول رہی ہے۔ کوئی لمحہ، کوئی قدر، اور کوئی حقیقت وقت کی گود میں دفن ہو کر فنا نہیں ہو گئی بلکہ ایک ابدی زندگی کے خواب کی طرح اُس کے اشعار میں آنکھیں کھولے ہوئے ہیں اور ایاز ان کو نئے لفظ، نئے جسد اور نئے روپ میں آباد کرتا جا رہا ہے اور اپنے عہد کی آنکھ دے رہا ہے۔ کتاب کے مرتب برادرم آصف فرخی نے لکھا ہے۔ "اس سخن ور کی شاعری شیوہ ہزار رنگ ہے اور شخصیت سامان صد فتنہ ہے۔"

"شیخ ایاز، ایک ادیب، شاعر، افسانہ نگار، معلم، مفکر، قوم پرست، سیاست کار، ایک انقلابی، سرزمین سندھ کے ایک سرمایہ افتخار فرزند۔ اُن کے بارے میں کیا کہیے۔ وہ اپنی ذات میں ایک ادارہ، ایک عہد تھے، بہت نازک خیال، شیشہ نفس، آتش نوا، ہمارے عہد کے ایک یادگار، یادگار زمانہ قلم کار۔ ان پر کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اُن پر کتابیں لکھی جائیں گی۔"

کرنے لگی۔ "لیکن یہ بہشت و دوزخ کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ میں تو سوچ سوچ کر الجھ جاتی ہوں۔ میٹرک میں ہمیں اُستاد نے بتایا تھا کہ انسانی رُوح میں خدا کا جزو ہے، اگر ایسا ہے تو پھر تو دوزخ میں بھی تو صرف رُوح جاتی ہے اور اس کا مطلب یہ ہوا کہ دوزخ میں خدا خود جاتا ہے۔" وہ مذہب پر ہنسنے لگی۔

میں سوچنے لگا کہ اس کو ایسے شرارت بھرے خیالات کیسے آتے ہیں؟ خدا کو بھی نہیں بخشتی۔

اُس کی ہنسی میں زندگی تھی اور زندہ دلی تھی۔ ہنسنے ہوئے اُس کے رخساروں میں جیسے سفید اور سرخ گلاب گھل مل جاتے تھے اُس کے نازک لب خنجر آلود ہو جاتے تھے۔ میں نے اُسے مسکراتے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہمیشہ ہنستی رہتی تھی اور اُس کی ہنسی میں دنیا بھر کا سنگیت سما جاتا تھا۔ اُس کے قہقہے میں معصومیت

تو مجھے رونا آتا ہے۔ ہنسی کیسے آئے گی۔"

"اب بکواس چھوڑو!" میں نے ڈانٹ کر کہا۔ "ایسے آدمی دیکھ کر تمہارا دل خراب ہو جاتا ہے۔"

"دل خراب تو تمہارا پڑھ پڑھ کر خراب ہو گیا ہے۔" یہ کہہ کر وہ پھر ہنسنے لگی۔ "بتاؤں کہ کیوں ہنس رہے تھے۔ میں نے زہرہ کو بتایا کہ تم نے بی۔ اے میں فلسفہ لیا ہے۔ اس پر اُس نے ایک فلسفی کی بات سنائی کہ کیسے اُس نے دیوار پر اُپلے گئے دیکھ کر کہا کہ یہ گوبر گائے نے اس دیوار پر کیسے کیا؟ اس پر مجھے بہت ہنسی آئی۔"

ایک بار میں اُسے جمہوریت کے اصول سمجھا رہا تھا۔ "لیکن خدا تو ہمیں جمہوریت نہیں سکھاتا۔" اُس نے کہا۔ "خدا تو اکثریت کو دوزخ میں ڈالتا ہے اور بہت کم لوگوں کو جن میں سلا اور مست پاگل آجاتے ہیں وہ بہشت میں بھیج دیتا ہے۔" وہ تقریر

رہی ہے۔ مجھے آنکھیں کھولتے دیکھ کر میری پینہ پر وہی پنکھا دے مارا اور یہ کہتے ہوئے اُنھ کھڑی ہوئی کہ ”نیند میں کیوں بڑبڑا رہے تھے، ہماری نیند خراب ہو رہی تھی۔“

جب اکٹھے کھانا کھانے بیٹھے تھے تو کہتی تھی، دیکھنا میں تمہیں بھوکا ماروں گی اور پھر قہقہہ مار کر ہنستی تھی لیکن میں نے دیکھا تھا کہ وہ بہت کم کھاتی تھی اور ابھی ابھی چیزیں میرے لیے رکھ دیتی تھی۔

ایک دن مجھے سخت بخار ہو گیا۔ میں نے اپنی بہن سے کہا کہ ذرا سر دبا دو۔

اس نے ڈانٹ کر کہا۔ ”دو گھنٹے سے مسلسل خالہ زلو بہن آپ کا سر دبا رہی تھی اور اب بھی سر دبانے کو کہہ رہے ہیں۔“ مجھے معلوم بھی نہ تھا کہ فحشی کے عالم میں وہ میرا سر دبا رہی تھی۔ اس طرح کئی بار میں نے محسوس کیا کہ اُس نے مجھ سے ہم دردی کی تھی۔

میں نے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا تو اس کے گھر گیا۔ اس نے کہا۔ ”منٹھائی کھلائیں۔“ اور پھر زوردار قہقہہ لگا کر بولی۔ ”چلو کنگال، تم کیا کھلاؤ گے۔“ یہ کہہ کر ہنسنے لگی۔

میری شادی ہو گئی۔ وہ آئی اور بولی۔ ”منٹھائی کھلاؤ“ اور پھر ”چلو کنگال، تم کیا کھلاؤ گے۔“ کہہ کر ہنسنے لگی۔

میرے ہاں بیٹا پیدا ہوا تو وہ آئی اور پھر دہی۔ ”منٹھائی کھلاؤ!“ یہ کہہ کر بولی۔ ”چلو کنگال، تم کیا کھلاؤ گے۔“ اور پھر زوردار قہقہہ۔ اس میں ابھی تک وہی معصوم شرارت تھی۔ اب بھی زندہ دلی تھی۔ اب بھی ہنسنے ہوئے اُس کے آنسو نکل آتے تھے۔

کل وہ میرے بیٹے کو گود میں کھلا رہی تھی۔ میرے بیٹے سے اُسے بہت محبت تھی۔ چہ گھنٹے چلنا سیکھ گیا تھا۔ کل وہ چہچہ کو اچھال رہی تھی۔ میں دفتر سے واپس آیا تھا۔ چہ نے مجھے دیکھ کر کہا۔ ”با آبا!“ میں نے اُسے اٹھانے کے لیے بازو بڑھائے لیکن چہ سر ہلا کر اُس کے سینے میں چھپنے لگا اور بولا۔ ”اُم۔ ماں۔“

میں نے مذاق سے کہا۔ ”اُمے تمہاری امی تو روٹی پکارتی ہیں۔ یہ تو تمہاری چھو بھئی ہیں!“ لیکن چہ نے میری بات نہ مانی اور اُس کے سینے سے منہ نکال کر اُس کے چہرے کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”اماں۔“ اچانک میں نے دیکھا کہ اُس کا چہرہ فق ہو گیا اور آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر اُس کے گالوں پر بہنے لگے۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا کیوں خیر تو ہے؟

اُس نے چہ کے گال پھوسے اور اس کی قمیص میں منہ پٹھپاکر سسکیاں بھرنے لگی۔ میں دیکھتا رہ گیا۔

اور شرارت ہوتی تھی۔ ہاتھ ہاتھ میں ملا کر ہنستے ہوئے گم ہو جاتی تھی۔ تنہا ہوتی تو گاتی رہتی تھی، جب آدمی دیکھے گی تو ہنس پڑتی جیسے ساری دنیا کی خوشی اُس کی روح میں سمائی ہوئی تھی۔ وہ اتنا ہنستی تھی کہ اُس کی آنکھوں سے آنسو نکل آتے تھے اور یہ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ وہ ہنس رہی ہے یا رو رہی ہے۔ اُس کی زندگی میں مسکراہٹ اور آنسو ملے جلتے تھے، وہ ہر ایک کو پریشان کرتی تھی لیکن کوئی بھی اس سے خائف نہ تھا۔ میں تو اس سے اس لیے نفرت کرتا تھا کہ مجھے اُس سے محبت تھی اور محبت اس لیے کرتا تھا کہ مجھے اس سے نفرت تھی۔ میٹھی میٹھی نفرت۔ کڑوی کڑوی محبت۔ دُور ہو کر دُور رہنا نہیں چاہتا تھا اور نزدیک ہو کر تنگ ہو جاتا تھا۔ میری اور بھی خالہ زاد، چچا زاد بہنیں تھیں لیکن اور کوئی بھی ایسی عجیب و غریب نہ تھی۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ مجھ سے شرارت کر سکے۔ سب کتابی کیزا سمجھ کر میری عزت بھی کرتی تھیں اور نفرت بھی۔ لیکن نہ جانے کیوں وہ مجھے چھیڑتی رہتی تھی، میں کتاب کے کسی صفحے پر نشان ڈال کر جاتا تو وہ نشان نکال کر کسی اور صفحے پر رکھ دیتی، میں فاؤنٹین پین میں سیاہی بھرتا تو وہ سیاہی نکال کر اس میں پانی بھر دیتی۔ مطلب یہ کہ عجیب شامت تھی۔ میں نے کئی بار سوچا کہ پھر اس کے گھر نہیں جاؤں گا۔ دو ڈھائی گھنٹے بعد ہی وہ کوئی بہانہ کر کے کسی کو بھیج کر بلا لیتی۔ مثال کے طور پر کہلو اگر بھیج دیتی کہ امی کے سر میں درد ہے، دوا دینے کو بلایا ہے اور میں دوائی لے کر پہنچتا تو پیغام دینے والا غائب ہو چکا ہوتا، مجبوراً مجھے ہی دوا لے کر اس کے گھر جانا پڑتا۔ جب میں گھر میں داخل ہوتا تو وہ ہنس کر کہتی۔ ”دیکھو کس طرح چالاکی سے بلوایا۔ اب پتہ لگا۔“

اور پھر رستی کو دے لگتی۔ لیکن ایسا بھی نہیں کہ وہ مجھے صرف شرارت کرنے کے لیے بلواتی۔ مجھے یاد ہے کہ کڑا کے دار گری میں پڑھتے ہوئے مجھے نیند آگئی اور پسینے کی وجہ سے کروٹیں بدل رہا تھا کہ ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے پر آنکھ کھل گئی۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو وہ پنکھا جھل

ہر قسم کی کوارٹز اور آٹو میٹک گھڑیوں کی سروس اور ریپیرنگ کے لیے

محسن واج سینٹر

دکان نمبر ۲۱، حکیم سینٹر نزد صدر پوسٹ آفس،

صدر کراچی۔ فون: 513681-5673215